ڈاکٹر شفیق عجمی

شعبۂ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

بھارت میں اقبال شناسی

Dr. Shafiq Ajmi

Department of Urdu, G C Universtiy, Lahore

Iqbal's Perceptive in India

Like other regions of the World, in India, a very wide range of prominent scholars from Dr. Yusuf Hussain Khan to Ali Sardar Jafri and Dr. Sinha to Jagan Nath Azad with many other critics, focus on the art and thought of Iqbal.

In universities, researchers opted to work on the Poetry and Philosophy of Iqbal and Literary journals covered Iqbal exclusively on different occasions during the Twentieth Century.

بھارت میں اقبال شناسی کی روایت بھی کئی طرح کے نشیب و فراز سے گزری ہے۔ اسے کئی طرح کی مشکلات اور تصعبات کا بھی سامنا رہا ہے۔ بعض مخصوص ترجیحات پر حد سے زیادہ اصرار اور اس کے نتیجے میں مخصوص رجحان سازی کی فضا بھی موجود رہی ہے لیکن اس روایت کے برگ و بار کسی طرح کے حالات میں بھی مرجھائے نہیں بلکہ نشو و ارتقاء کے مراحل طے کرتے رہے ہیں۔ البتہ اس روایت کے جائزے اور مطالعے ہمیشہ عصری سیاست سے گراں بار ضرور رہے ہیں۔ برصغیر کے مخصوص سیاسی حالات بھی اس میں کہیں نہ کہیں حائل رہے ہیں لیکن ایک جوئے کہستاں کی طرح یہ روایت اچکتی، اچھلتی، سنبھلتی اور بڑے پیچوں سے بڑی کامیابی کے ساتھ نکلتی ہوئی رواں دواں رہی ہے۔

بھارت میں اقبال شناسی کی روایت کا ایک روشن نام پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا بھی ہے جن کی وفات (۲۴ جولائی ۲۰۰۴ء) پر ہمارے ایک کالم نگار نے لکھا:

> ''جگن ناتھ آزاد نے بھارت میں اقبال کے حوالے سے اس وقت کام کا آغاز کیا جب بھارت میں اقبال کا نام لینا غداری کی ذیل میں آتا تھا''(۱)۔

لیکن ہمارے دانشور کالم نگار نے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ کیا کبھی بھارت میں جگن ناتھ آزاد کو ''غدار'' کہا گیا۔ چلئے وہ تو تلوک چند محروم کا بیٹا تھا، کیا کسی اور اقبال شناس کو کبھی یہ لقب دیا گیا۔ پروفیسر یوسف حسین خان، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، علی سردار جعفری، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالمغنی ایسے کتنے ہی نام لئے جا سکتے ہیں جنہوں نے اقبال پر لکھا، اقبال کا نام لیا، اقبال پر کانفرنسوں، جلسوں کا اہتمام کیا لیکن نہ تو کسی نے ان کو اقبال پہ لکھنے سے روکا نہ اقبال پہ لکھنے پر غدار ہی کہا۔ علمی روایات میں سیاسی نعروں کی کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔

بھارت میں اقبال شناسی کے حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ایک مضمون سے درج ذیل اقتباس کو حوالہ بنایا ہے:۔

''(۱۹۵۵ء) میں جناب آصف علی اصغر فیضی جموں وکشمیر یونیورسٹی' سری نگر کے وائس چانسلر تھے۔انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ.....میں تین لیکچر غالب کے فکر وفن پر دوں۔میں نے ان سے کہا کہ غالب پر بھی کبھی لیکچر دوں گا لیکن اس وقت تو مجھ سے اقبال پر لیکچر دلوایئے۔فیضی صاحب جیسے سناٹے میں آ گئے۔فرمانے لگے: ۱۹۴۷ء سے آج تک کسی نے جموں وکشمیر میں اقبال کا نام نہیں لیا' آپ کیوں اس موضوع پر لیکچر دینا چاہتے ہیں؟ (میں نے کچھ دلائل دے کر کہا) اس یونیورسٹی میں اقبال پر لیکچروں کا انتظام بہت پہلے ہونا چاہئے تھا.....تین روز غور وفکر کے بعد انہوں نے رسمی دعوت نامہ مجھے دے دیا''(۲)۔

ڈاکٹر ہاشمی نے جگن ناتھ آزاد کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے:۔

''اقبالیات کے ضمن میں تقسیم ہند کے بعد ابتدائی سات آٹھ برسوں میں بھارت میں ہمیں سناٹے کی وہی کیفیت نظر آتی ہے جو اقبال پر تین لیکچروں کی تجویز سن کر کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر فیضی صاحب پر طاری ہوئی تھی''(۳)۔

''سناٹے'' کے سیاسی محرکات کو انہوں نے اس صورتحال میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو تقسیم ہندوستان کے بعد بھارت اور کشمیر میں پیدا ہو چکی تھی اور جس میں اقبال کا تصور' دوقومی نظریئے کے ایک پُر جوش داعی اور مبلغ کے طور پر ابھرا تھا جو براہ راست اس تقسیم کا ذمہ دار تھا(۴)۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبالیات کی داستان کو ایک سناٹے اور ہنگامے کی ملی جلی داستان تو ضرور قرار دیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال کے متعلق کوئی منفی کھلم کھلا پراپیگنڈہ کسی طرح پر ہوا ہو یا کوئی ایسا حکم نامہ جاری ہوا ہو کہ اقبالیات کا موضوع شجر ممنوع کی حیثیت رکھتا ہو اور پھر یہ کہ یہ سناٹا علمی اور ادبی ماحول میں نہیں' سماجی اور مجلسی ماحول میں ملتا ہے یا سناٹے سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ آزادی کے دو چار سال بعد تک ہمارے ملک کے اہل قلم نے اقبال پر کچھ لکھا ہی نہیں(۵)۔

بھارت میں اقبال شناسی کو موضوع بنانے والے ان دونوں اقبال شناس حضرات نے اپنے اپنے مضامین میں نہ صرف آزادی کے بعد اقبال کے حوالے سے ہونے والے اہم کام کا جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں اہم تصانیف پر نظر ڈالی ہے بلکہ ان علمی وادبی رسائل وجرائد کی نشاندہی بھی کی ہے جس میں اقبال اور افکار اقبال پر اہم تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی سے پہلے شائع ہونے والی بعض اہم تصانیف' آزادی کے بعد بھی بار بار شائع ہو کر فضا پہ چھائی ہوئی اس خاموشی اور سناٹے کی کیفیت کو توڑنے کا ذریعہ ثابت ہوئی ہیں جس کا بے حد تذکرہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر یوسف حسین خان کی ''روح اقبال'' بھی ایسی ہی ایک تصنیف ہے جو پہلی بار ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد بھی اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے(۶)۔

ستمبر ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہونے والے یوسف حسین خان نے اپنی تعلیم اٹاوہ اور علی گڑھ میں حاصل کی۔۱۹۲۹ء میں انہوں نے سوریوں یونیورسٹی' پیرس سے ''ازمنہ وسطیٰ کے ہندو مسلم تصوف'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ کر ڈگری

حاصل کی۔آپ عثمانیہ یونیورسٹی' حیدرآباد' دکن سے ۱۹۵۷ء تک وابستہ رہے اور اسی دوران انہوں نے تاریخ اور عمرانیات کے علاوہ ''روح اقبال'' (۱۹۴۲ء) اور اردو غزل (۱۹۴۹ء) تصنیف کیں۔۱۹۵۸ء میں آپ کا تقرر مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ میں بطور پرووائس چانسلر ہوا جس پر آپ ۱۹۶۵ء تک فائز رہے۔۱۹۶۷ء میں انہوں نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی دنیا'' لکھی۔کچھ عرصہ انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس سٹڈیز' شملہ میں ریسرچ فیلو بھی رہے۔۱۹۶۷ء میں ہی ''حافظ اور اقبال'' منظر پر آئی۔۱۹۷۷ء میں جشن اقبال صدی کے موقع پر غالب اکیڈمی' دہلی میں ''غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات'' کے موضوع پر دو لیکچر دیئے جو کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔۲۱ فروری ۱۹۷۹ء میں آپ کا انتقال ہوا اور جامعہ اسلامیہ' دہلی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

''روح اقبال'' کے مباحث کو تین حصوں: ا۔آرٹ ۲۔تمدن ۳۔مذہب میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں سے آرٹ والا حصہ' انجمن ترقی اردو کے رسالہ ''اردو'' کے اقبال نمبر (۱۹۳۸ء) میں شائع ہو چکا ہے۔حصہ تمدن کے بعض اجزاء' رسالہ ''سیاست'' میں شائع ہوئے تھے۔ پہلے ایڈیشن (۱۹۴۲ء) کے بعد جتنے ایڈیشن شائع ہوئے' ان میں نئی معلومات کا اضافہ بھی کیا گیا (۷)۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان پر پی ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھنے والی خاتون محقق' ڈاکٹر شبیہ کاظمی نے اپنے ایک مضمون میں ''روح اقبال'' کو اقبال پر لکھی جانے والی دوسری کتب' ''سیرت اقبال'' (از طاہر فاروقی)' ''اقبال کامل'' (از عبدالسلام ندوی)، ''اقبال نئی تشکیل'' (عزیز احمد) اور ''فکر اقبال'' (ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم) پر فوقیت دی ہے کہ اقبال کے افکار و فلسفوں کو ربط و تسلسل اور جامعیت کے ساتھ پیش کرنے میں ''روح اقبال'' کے علاوہ ان میں سے کوئی بھی تصنیف اس معیار پر پوری نہیں اترتی کیونکہ مذکورہ تصانیف میں اقبال کے افکار و خیالات اس طرح بکھرے پڑے ہیں کہ اقبال کے قاری کے لئے ان کو سمیٹنا' سمجھنا اور ذہن نشین کرنا نہایت مشکل ہے (۸)۔

''روح اقبال'' کی اہمیت مسلمہ ہے اور اقبالیاتی ادب میں مذکورہ دوسری کتب کو بھی گراں قدر مقام حاصل ہے۔حیرت ہے کہ ڈاکٹر شبیہ کاظمی نے ان کتابوں کے ساتھ ڈاکٹر رفیع الدین کی ''حکمت اقبال'' کا تذکرہ نہیں کیا۔غالباً وہ ان کی نظر سے نہیں گزری کیونکہ جس طرح سے اس تصنیف میں اقبال کے افکار و خیالات کو ایک مربوط نظام فکر کے تحت پیش کیا گیا ہے اس کا اعتراف اقبال شناس حلقوں نے بھی کیا ہے' جس کا ذکر آگے اپنے موقع پر آئے گا۔البتہ ''روح اقبال'' کے حوالے سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے بعد کے ناموافق حالات میں اس کی مسلسل اشاعتوں سے موافقت کی فضا پیدا کرنے میں مدد ملی بلکہ اقبال شناسی کے نئے در بھی وا ہوئے اور اقبال پر قلم اٹھانے والوں کو رہنمائی بھی حاصل ہوئی۔لہٰذا مختصر الفاظ میں یہ ایک جامع تجزیہ ہے کہ ''روح اقبال'' کو یوسف حسین خان کا سب سے اہم ادبی کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے'' (۹)۔

اس کے برعکس' سال آزادی میں' آزادی سے کچھ پہلے (جنوری ۱۹۴۷ء) میں شائع ہونے والی ڈاکٹر سچدانند سنہا کی انگریزی تصنیف "Iqbal: The Poet and his Message" کو بعض حوالوں سے اقبال کے استرداد کی ایک کوشش سمجھا جاتا ہے (۱۰)۔اور اکثر اقبال شناسوں نے اسے اقبال کا منفی اور معتصبانہ مطالعہ قرار دیا ہے۔وہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ہوں جن کا کہنا ہے ''سنہا صاحب نے اپنا تمام زور قلم اس بات کے ثابت کرنے پر صرف کیا ہے کہ اقبال نہ تو فلسفی تھے نہ شاعر نہ سیاست دان' بلکہ ایک متعصب مسلمان قوم پرست جنہیں صرف اپنی قوم اور اپنے ہم مذہبوں سے ہمدردی تھی۔وہ اپنے اسلاف کی عظمت کا راگ الاپتے رہے اور دنیا پر مسلمانوں کے تسلط اور اقتدار کا خواب دیکھتے رہے (۱۱)۔یا سید عبدالواحد معینی جنہوں نے خود سنہا سے بھی زیادہ سخت زبان استعمال کرتے ہوئے اس کی کتاب کو پوچ اور بیہودہ قرار دیا جو تعصب اور تنگ دلی کی ایک روشن مثال ہے (۱۲)۔

البتہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے سنہا کا شمار بھارت کے ان فضلاء میں کیا ہے جنھوں نے اقبال پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ وہ سنہا کے سماجی مقام اور مرتبے سے آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ ادیب کم اور سیاست دان زیادہ ہیں اور جس زمانے میں انہوں نے یہ کتاب لکھی وہ ہندو مسلم سیاسی کشیدگی کا دور تھا جس کے اثرات اس کتاب میں پیش کئے جانے والے خیالات پر بھی پڑے ہیں (۱۳)۔

کتاب کے آغاز میں مصنف کا تفصیلی تعارف دیا گیا ہے جس کے مطابق سچدانند سہنا' ۱۰ نومبر ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پٹنہ کالج اور پھر سٹی کالج کلکتہ سے تعلیم حاصل کی۔ کلکتہ' الہ آباد اور پٹنہ ہائی کورٹ میں وکالت کی۔ ''ہندوستان ریویو'' کے بانی ایڈیٹر کے طور پر ۱۹۰۰ء سے اپنے فرائض کا آغاز کیا۔ ممبر امپیریل لجسلیٹو کونسل (۱۹۱۰ء) اور انڈین لجسلٹیو اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۶ء' گورنر کے ایگزیکٹو کونسلر کی حیثیت میں بہار اور اڑیسہ کی حکومتوں میں وزیر خزانہ اور وزیر قانون رہے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۴ء تک پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے اور تاحیات سینیٹر پٹنہ یونیورسٹی بھی منتخب ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی (۱۹۳۷ء)۔ انہوں نے اقبال پر لکھی جانے والی زیر بحث تصنیف کے علاوہ تقسیم بنگال' کشمیر' مشاہیر بہار اور کئی دوسرے موضوعات پر انگریزی میں کتابیں تحریر کیں (۱۴)۔

"Iqbal: The Poet And His Massege" پانچ سو سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی ایک ضخیم کتاب ہے جو اٹھائیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ابواب کی تعداد ۲۴ لکھی ہے (۱۵)۔ جو درست نہیں۔ نواب یار جنگ بہادر' سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر امرناتھ جھاء نے تعارف اور تنقیدی آراء لکھی ہیں۔ کتاب کے آخر میں تین ضمیمے بھی شامل کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر سنہا نے اٹھائیس ابواب میں اقبال کی حیات' شخصیت اور تصانیف کے علاوہ' ہندوستان کے ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی عظمت' ان کے مذہبی' فلسفیانہ اور سیاسی پس منظر' ان کی اردو' فارسی شاعری' قومی اور بین الاقوامی سطح کے شعراء کے ساتھ ان کے تقابل' ان کے تصور اسلام اور انسان دوستی اور مقبولیت کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر سنہا نے اس کتاب کو کو نو برس کی مدت میں مکمل کیا یعنی اقبال کی وفات (۱۹۳۸ء) کے فوراً بعد ہی انہوں نے اس پر کام شروع کر دیا تھا جو ۱۹۴۷ء میں تکمیل کو پہنچا۔

وہ سمجھتے ہیں کہ اقبال کے کام کا جائزہ لیتے ہوئے اب تک توصیفی انداز اختیار کیا گیا ہے جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کو صحیح معنوں میں تنقیدی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ لہٰذا یہ کتاب ان کے اس نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس کے لئے انہوں نے بالخصوص مغربی تنقید نگاروں کے حوالوں اور اقتباسات سے اپنی کتاب کو پوری طرح سے مزین کیا ہے۔ اور اس کا آغاز باب اول کے صفحہ اول ہی سے ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی ''حقیقی تنقید'' سے اقبال کی فلسفیانہ حیثیت' ان کی مذہبیت' تصور ملت' آفاقیت اور فارسیت کو ہدف بنایا ہے اور فیصلہ دیا ہے کہ وہ کسی طرح سے بھی عالمی سطح کے شعراء کی صف میں جگہ نہیں پا سکتے ہیں۔

سر تیج بہادر سپرو نے اگر ایک طرف ڈاکٹر سنہا کی اس کاوش کو سراہا ہے تو دوسری طرف اس میں اقبال کی فارسی شاعری اور اقبال کے فلسفہ پر لکھے جانے والے ابواب کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے جن میں تنقید کا وہ انداز اختیار کیا گیا ہے جسے اقبال کے مداح کبھی بھی پسندیدہ قرار نہیں دے سکتے (۱۶)۔

ڈاکٹر سنہا کا اقبال پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ انہوں نے اپنے شعری اظہار کے لئے اردو سے زیادہ فارسی کو اختیار کیا ہے حالانکہ

اگر وہ زیادہ سے زیادہ اردو میں لکھتے تو ان کے ہم وطن اس سے بہتر طور پر مستفید ہو سکتے تھے۔ مرزا یار جنگ سمیع اللہ نے ڈاکٹر سنہا کے اس اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے اور ان کے اس اصول کو انہی پر لاگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے اقبال پر کتاب لکھتے ہوئے اپنی مادری زبان کی بجائے انگریزی کا انتخاب کس اصول کے تحت کیا ہے(۱۷)۔

پروفیسر میاں محمد شریف نے "An Unfinished Letter" کے عنوان سے ڈاکٹر سنہا کے اس کتاب میں اپنا مؤقف دیانتداری اور خوش اسلوبی سے پیش کرنے کی تعریف کی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ آپ کا نقطہ نظر میرے مؤقف کی ضد ہے اور پھر تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر سنہا کے اعتراضات کا جواب دیا ہے(۱۸)۔

بعض ناقدین نے ڈاکٹر سنہا کی کتاب کے علاوہ مجنوں گورکھپوری کی ۱۹۵۰ء کے آس پاس شائع ہونے والی مختصر سی کتاب ''اقبال (اجمالی تبصرہ)'' کو بھی اقبال پر لکھی جانے والی انہی کتابوں کے زمرے میں شامل کیا ہے جن میں اقبال اور افکار اقبال کا جائزہ لیتے ہوئے ناروا تنقیدی انداز اختیار کیا گیا ہے(۱۹)۔

حالانکہ مجنوں گورکھپوری' اقبال کو پُر جوش انداز میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں صاحب بصیرت اور دانائے راز بھی قرار دیتے ہیں جن کی جگہ مدت تک کوئی دوسرا لیتا نظر نہیں آتا(۲۰)۔

ان کو اقبال کی شاعری میں موجود کئی طرح کی خامیاں بھی کھٹکتی ہیں اور ایک سے زیادہ غلط اور مایوس کن موڑ بھی نظر آتے ہیں' لیکن اس کے باوجود ان کا اصرار ہے کہ اقبال کو عہد آفریں شاعر ماننے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو(۲۱)۔

ڈاکٹر سنہا کے برعکس' جو اقبال کی اردو شاعری کے مقابلے میں حالؔی کی مسدس کے زیادہ قائل ہیں' مجنوں گورکھپوری کے نزدیک حالؔی' اقبال کی طرح نہ تو کوئی مفکر تھے اور نہ ہی ان کے اندر ایسی بصیرت تھی جو دور تک مستقبل کا احاطہ کر سکتی.....وہ زیادہ سے زیادہ مسدس کے شاعر ہو سکتے تھے(۲۲)۔

اقبال پر مغربی مفکرین کے اثرات سے متعلق بیشتر اقبال شناسوں کے مباحث افراط و تفریط کی مثال پیش کرتے ہیں لیکن مجنوںؔ کے یہاں اس بحث کے حوالے سے محتاط اور معتدل انداز نظر آتا ہے۔ وہ اقبال کی فکر و بصیرت کی تربیت میں مغربی حکماء و ادباء کے مطالعے بالخصوص گوئٹے' نطشے' ہیگل' برگساں اور شعراء میں ورڈزورتھ' ہائنا' براؤننگ اور ایمرسن کے اثرات کو تسلیم کرتے ہیں۔ جرمن فلسفی اور ماہر ریاضیات لائبنز (Leibnitz) کی Theory Of Monds اور فلسفہء خودی میں مماثلت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں لیکن وہ اقبال کی اخذ اور جذب کی خداداد صلاحیت کے بھی معترف ہیں جس کی بدولت ان کے ہاں مشرقی خیالات اور مغربی افکار کی ایسی تہذیب اور امتزاج نظر آتا ہے جو اردو شعراء کے ہاں تو کیا ٹیگور کو چھوڑ کر کسی زبان کے شاعر کے کلام میں نہیں ملتا(۲۳)۔

اقبال کے تصور عشق اور آزادی پر خوبصورت بحث کرتے کرتے اچانک مجنوں پر اضمحلال سا طاری ہو جاتا ہے جو ان کے نزدیک سبب ہے اقبال کے آفاقیت اور وسیع تر انسانیت سے محدود ملت اور حجازیت کی طرف مراجعت کا جو آگے چل کر ایک زیادہ خطرناک میلان کی صورت اختیار کر جاتی ہے جسے مجنوںؔ عقابیت کا نام دیتے ہیں جو فاشزم کی ہی ایک صورت ہے۔ قاری اُس وقت مجنوں سے زیادہ مضمحل اور منتشر ہو جاتا ہے جب مجنوںؔ' اقبال کے تخلیقی سفر میں موجود رفعت اور رجعت کا تجزیہ کرتے ہیں اور ان کی خامیوں کی علت ان کی ''پنجابیت'' کو قرار دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں فکری گمراہیوں اور مایوس کن موڑوں کی نشاندہی کرنے والا مجنوں دفعتاً ایسا ''یوٹرن'' لیتا ہے جو پڑھنے

والے کے لئے ناقابلِ فہم بن جاتا ہے۔

اقبال کے بارے میں مجنوں کے ہاں تحسین اور تردید کا یہ متضاد رویہ مسلسل نظر آتا ہے، جس کا احساس یقینی طور پر خود ان کو بھی اور قاری کو بھی ہو جاتا ہے جب بالآخران کی بحث کا اختتام بھی اسی مقام پر ہوتا ہے جس سے ان کی بحث کا آغاز ہوا تھا:۔

''اقبال اپنی کبھی کبھی کی رجعت، اسلاف پرستی اور بعض اوقات غلط سمتوں مڑ جانے کا باوجود مجھے، زندگی، انقلاب اور ترقی کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی اور بالیدگی کی جیسی شدید اور بھرپور قوت اقبال کی آواز میں محسوس ہوتی ہے، نہ ان سے پہلے کسی اردو شاعر کی آواز میں محسوس ہوتی ہے اور نہ ان کے بعد'' (۲۴)۔

ڈاکٹر سنہا کی ۱۹۴۷ء میں شائع ہونے والی کتاب "Iqbal: The Poet And His Message" اور مجنوں گورکھپوری کی ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آنے والی کتاب ''اقبال (اجمالی تبصرہ)''، ڈاکٹر ہاشمی کے نزدیک اقبالیاتِ بھارت میں منفی رجحان کی نمائندہ کتابیں ہیں اور چونکہ اقبالیات کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی گئی تھی، اس لئے بعد ازاں اس پر تعمیر ہونے والی عمارت کی دیواروں میں ایک طرح کی ''کجی'' بہرحال موجود رہی ہے (۲۵)۔

ان دونوں کتابوں کو اقبالیات کی پہلی اینٹ قرار دینا اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ یہ تقسیم کے بعد لکھی جانے والی کتابیں ہیں، تو سوال یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے اور خاص طور پر اقبال کی وفات کے فوراً بعد لکھی جانے والی کتابوں کو اقبالیات کی بنیاد یا اینٹ کیونکر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیا ایسا کرتے ہوئے ہم برصغیر میں اقبال شناسی کی روایت اور اس کے ارتقاء سے چشم پوشی کے مرتکب نہیں ہو جاتے؟ صرف ایک مثال، یوسف حسین خان کی ''روح اقبال'' پر اکتفا کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ اس کو اقبالیات کی بنیاد یا پہلی اینٹ کیوں نہیں کہا جا سکتا۔ صرف ڈاکٹر سنہا اور مجنوں گورکھپوری ہی اس اولیت کے حامل کیوں قرار پاتے ہیں؟ پہلے دو منفی مثالوں (اور یہ بھی بحث طلب مسئلہ ہے) کو بنیاد بنا کر اور پھر پوری روایت کو اس کا عکس قرار دے دینا، کسی روایت کی جانچ اور پرکھ کا درست اور حقیقت پسندانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اقبال ایسی ہمہ جہت شخصیت کے افکار اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تفہیم میں تحسین کے ساتھ ساتھ تضادات کی نشاندہی بھی کوئی غیر فطری امر نہیں اور نہ ہی اس کو اقبال ناشناسی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اقبال کے افکار زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب کے لئے باعث کشش رہے ہیں اور خود ڈاکٹر ہاشمی کو بھی اس کا اندازہ ہے اور انہوں نے اس کو اقبال کے فکر و فن کا معجزہ قرار دیا ہے کہ مختلف بلکہ متضاد نظریات رکھنے والے (ترقی پسند، جدیدیت پرست، اشتراکی، صوفیہ، آزاد خیال، قدامت پرستی اور جماعت اسلامی سے وابستہ) اصحاب نے بسا اوقات یکساں جوش و خروش اور ولولے سے اقبالیات میں دلچسپی لی ہے۔ بہرحال اس طرح وجود میں آنے والا ذخیرہ اقبالیات کا ایسا تابناک باب ہے جس کے بغیر اقبالیات کی کوئی تاریخ ممکن نہیں ہو سکتی (۲۶)۔

بلاشبہ مذکورہ ناموں کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی، میکش اکبر آبادی، ڈاکٹر عشرت حسن انور، ڈاکٹر غلام عمر، میر ولی الدین، عزیز احمد، مولانا ابوالحسن علی ندوی، عالم خوندمیری، آصف جاہ کاروانی، خواجہ غلام السیدین، علی سردار جعفری، اسلوب انصاری، عتیق صدیقی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، آل احمد سرور، مظفر حسین برنی، ڈاکٹر عبدالمغنی، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے نام اس روایت میں تابناکی کی اہم مثالیں ہیں۔

موخر الذکر شخصیت یعنی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اقبالیات کے ساتھ والہانہ وابستگی کے پیش نظر ان کے ایک ہم عصر ڈاکٹر خلیق انجم

نے درج ذیل الفاظ میں ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے:۔

''ہندوستان میں علامہ اقبال پر سب سے زیادہ اور سب سے بہتر کام پروفیسر آزاد ہی نے کیا ہے'' (۲۷)۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی ''اقبال کامل'' ۱۹۴۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اقبالیاتی ادب میں اس تصنیف کو ایک اہم مقام حاصل ہے' اس لحاظ سے بھی کہ بعد میں لکھنے والے اصحاب نے نہ صرف اس کے مباحث کو سراہا بلکہ اس سے استفادہ بھی کیا۔ خلیفہ عبدالحکیم نے ''فکر اقبال'' کے تعارف میں جن دو تصانیف کی اہمیت کا اعتراف کیا' ان میں ''اقبال کامل'' بھی شامل ہے:۔

''میرے نزدیک اقبال پر دو کتابیں نہایت عالمانہ' نہایت بلیغ اور نہایت جامع ہیں' ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب کی ''روحِ اقبال'' اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کی کتاب ''اقبال کامل''۔ ان دو کتابوں کو ملا کر پڑھیں تو اقبال کے کلام اور اس کی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا دکھائی نہیں دیتا جو محتاجِ تشریح اور تشنۂ تنقید باقی رہ گیا ہو'' (۲۸)۔

سید عبدالواحد نے بھی اس کو مایۂ ناز تصنیف قرار دیا جس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ عبدالسلام صاحب نے اس کے سالِ اشاعت تک جو تصنیفات اور تالیفات شائع ہوئی تھیں ان کا بغور مطالعہ کر لیا تھا اور اس میں ان سب کے حوالہ جات بکثرت موجود ہیں (۲۹)۔

''اقبال کامل'' میں اقبال کے سوانحی حالات' تصنیفات اور تصورات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا کا بیان ہے کہ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب (اقبال) کی زندگی اور کارناموں کے ہر حصہ کی تکمیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی مناسبت سے میں نے پہلے اس کا نام ''مکمل اقبال'' تجویز کیا تھا اور اب مولانا سید سلمان ندوی نے اس کا نام ''اقبال کامل'' رکھا ہے جو پہلے سے زیادہ بہتر ہے (۳۰)۔

مولانا عبدالسلام نے اپنی اس تصنیف میں نہ صرف اقبال کی اردو' فارسی اور انگریزی تصانیف کا تعارف پیش کیا ہے بلکہ ان کی بعض نامکمل اور زیرِ تجویز کتابوں' جن کے خاکے ان کے دماغ ہی تک محدود تھے اور ان کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی جیسے منطق الطیر' اردو رامائن' فراموش شدہ پیغمبر کی کتاب' قرآن پاک پر ایک کتاب' اسلامی اصول فقہ کی تجدید' تاریخ تصوف اور اسلام میرے نقطۂ نظر سے' پر روشنی ڈالی ہے (۳۱)۔

مولانا ندوی نے جہاں کلام اقبال کے ادبی محاسن کا تفصیلی جائزہ لیا ہے وہیں کلام میں موجود لفظی اور معنوی غلطیوں کی نشاندہی کیلئے ''اغلاط'' کا عنوان بھی قائم کیا ہے۔

''اقبال کامل'' میں اقبال کے فلسفۂ خودی' اس کے ماخذ اور متعلقات پر تفصیلی بحث شامل ہے۔

کتاب کا خاتمہ اقبال کے نعتیہ کلام پر ہوتا ہے جس کے بارے میں مولانا نے انکشاف کیا ہے کہ ''نعتیہ شاعری' ڈاکٹر صاحب کی پوری شاعری کا خلاصہ ہے'' (۳۲)۔

اقبال شناسی کی روایت میں حیدرآباد (دکن) کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔ حیدرآباد یا عثمانیہ یونیورسٹی سے متعلق اصحاب میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں' ڈاکٹر رضی الدین صدیقی' پروفیسر عزیز احمد' ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' پروفیسر غلام دستگیر رشید' ڈاکٹر عالم خوندمیری اور ڈاکٹر غلام عمر کی خدمات اس ضمن میں بے بہا ہیں جن کا علمی سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے بھی ان اقبال شناسوں کی خدمات کو سراہا ہے (۳۳)۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی اقبالیاتی کاوشوں کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور پروفیسر عزیز احمد کا تفصیلی ذکر پاکستان میں اقبال شناسی کے عنوان کے تحت آگے آئے گا گو کہ یہ اصحاب تقسیم سے پہلے اپنے علمی سفر کا آغاز کر چکے تھے۔

حیدرآباد دکن میں قائم اقبال اکیڈمی' اپنے مجلّے ''اقبال ریویو'' کی باقاعدہ اشاعت' عالمی سطح کے علمائے اقبالیات کے لیکچرز اور

دوسری علمی سرگرمیوں کے ذریعے افکار اقبال کے فروغ میں آج بھی متحرک ہے اور اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

علمائے اقبالیات دکن میں ڈاکٹر عالم خوندمیری بھی ایک قابل قدر مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے تصور زمان کا جس دقتِ نظری سے جائزہ لیا ہے (اور یہ ان کے ڈاکٹریٹ کا موضوع بھی تھا) وہ انہی سے مخصوص ہے۔ ڈاکٹر شمل جوان کے تحقیقی مقالے سے متعلق رہیں، پروفیسر خوندمیری کی بے حد قائل تھیں (۳۴)۔

''اقبال، کشش اور گریز'' ان کا مجموعہ مضامین اقبالیات ہے جس میں سرسید اور اقبال، اقبال اور تصوف، جاوید نامہ کا فکری پس منظر اور اس کے علاوہ اقبال کے تصور زمان پر مضامین شامل ہیں۔

حیدرآباد دکن کے حوالے سے جب بھی اقبال کا تذکرہ کیا جائے گا تو نواب بہادر یار جنگ کے دولت خانے ''بیت الامت'' کا ذکر ناگزیر ہو جائے گا جہاں نواب صاحب کی زندگی اور اس کے بعد بھی سالوں تک ہفتہ کو درس اقبال کا اہتمام کیا جاتا تھا جس میں عام طور پر پروفیسر غلام دستگیر رشید یا ڈاکٹر رضی الدین صدیقی افکار اقبال کے حوالے سے گفتگو کرتے تھے۔ بعض اصحاب نے ان مجالس علمی کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ سید عبدالواحد نے بھی ''نقش اقبال'' میں کئی مقامات پر اس کے بارے میں لکھا ہے اور درس کے حوالے سے خاص طور پر پروفیسر دستگیر کی دقتِ نظر، وسعت مطالعہ اور علامہ سے ان کی والہانہ محبت کو یاد کیا ہے (۳۵)۔

پروفیسر دستگیر نے افکار اقبال کے حوالے سے ''آثار اقبال''، ''حکمت اقبال'' اور ''فکر اقبال'' مرتب کیں جن میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، خلیفہ عبدالحکیم، میر ولی الدین، نواب بہادر یار جنگ، عبدالقادر، عاشق بٹالوی اور بعض دوسروں کے مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر دستگیر کے مجموعوں کے ان عنوانات کو بعد میں خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے بھی اپنایا اور اقبالیاتی ادب کو ''فکر اقبال'' اور ''حکمت اقبال'' کی صورت میں دو غیر معمولی تصانیف حاصل ہوئیں۔

اقبال اکیڈمی حیدرآباد دکن کی طرف سے ۱۹۸۵ء سے جاری کیا جانے والا ''اقبال ایوارڈ'' حاصل کرنے والوں میں ڈاکٹر عالم خوندمیری اور مظفر حسین برنی کے علاوہ پروفیسر غلام دستگیر رشید بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر ہاشمی نے دکن کے اقبال شناسوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر میر ولی الدین کو یاد نہیں رکھا جن کی تصنیف ''رموز اقبال'' حیدرآباد دکن ہی سے پہلی بار ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی جس میں ان کے مندرجہ ذیل پانچ مضامین شامل ہیں جو اس سے پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے تھے:۔

۱۔ فلسفہ خودی ۲۔ نظریہ عقل و عشق ۳۔ حدیث جبر و قدر ۴۔ عہد حاضر کا انسان ۵۔ مسلمان کی زندگی۔

یہ سب مضامین اپنی جگہ اہم ہیں جن میں فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے لیکن اول الذکر (فلسفہ خودی) جو اس مجموعے کا طویل ترین مضمون ہے اور کئی لحاظ سے اہم بھی ہے۔

میر ولی الدین نے خودی کی ماہیت کی وضاحت کے لئے نہ صرف قرآن و حدیث سے روشنی حاصل کی ہے بلکہ فلاسفہ مشرق و مغرب اور صوفیانہ فکر سے بھی استدلال کیا ہے۔ انہوں نے فلسفیانہ تشکیک کی اساس پر زمین و آسمان اور کاخ و کو کے بارے میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا اس جہان رنگ و بو میں کوئی شے حقیقی کہلائی جا سکتی ہے؟ وہ ڈیکارٹ کی راہ پر چلتے ہیں لیکن یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ خارجی اشیاء کی حقیقت سے انکار نہیں کر رہے ہیں محض شک کا اظہار کر رہے ہیں کہ انسان کا علم محدود اور مقید ہے۔ کائنات کی ہر شے کے بارے میں

شک کیا جاسکتا ہے لیکن یہ شک کرنا یعنی سوچنا شک سے بالاتر ہے اور ''میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں'' کو اس طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے کہ میری ذات یا خودی کے متعلق کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ میری روح' یا میری انا' یا میری خودی کا وجود میرے لئے ساری کائنات سے زیادہ یقینی اور قطعی ہے۔ یہی یافت بقول پروفیسر وائٹ ہیڈ کے افلاطون کے زمانے کے بعد سب سے زیادہ عظیم الشان فلسفیانہ یافت ہے۔ یہی فلسفہء جدید کا نقطہء نظر ہے اور اقبال کا فلسفہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے اور اسی مرکزی نقطہ کے گرد گردش کرتا ہے اور اسی کی روشنی میں کائنات' خودی اور خدا کی توجیہ کرتا ہے (۳۶)۔

میر ولی الدین ہوں یا اُن کے دیگر اقبال شناس رفقا' وہ سب افکار اقبال میں خودی کی مرکزی اہمیت کو تو تسلیم کرتے ہیں اور اپنے طویل یا مختصر مضامین میں اس کا جائزہ بھی لیتے ہیں لیکن میکش اکبر آبادی کی طرح کم لوگوں نے فلسفہء خودی کو ایک مستقل کتاب کا موضوع بنایا ہوگا جو ''نقد اقبال'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

میکش نے خودی کی تفہیم کے لئے نفی ءخودی کا راستہ اختیار کیا ہے اور وحدت الوجود کو بنیاد بناتے ہوئے اقبال کی مخالفت کی وجہ نفی ءخودی ہی کو قرار دیا ہے اور پھر حضرت ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود' سری شنکر کے نظریہ مایا' بدھ مت کے نروان اور افلاطون کے اعیان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جس کا نتیجہ ان کے الفاظ میں یہ نکلتا ہے کہ:۔

> ''ابتداء میں اقبال نے وحدت الوجود کی مخالفت کرتے ہوئے ابن عربی اور سری شنکر کے نظریات کے فرق کو واضح طور پر نہ سمجھا اور نہ ہی تصوف کے تصور فنا اور بدھ مت کے فنا کے فرق کو محسوس کیا حالانکہ ان میں لفظی مشابہت کے سوا کوئی شے مشترک نہیں۔ مزید یہ کہ اقبال نے تصوف کو ترک عمل کے مترادف خیال کیا جو کہ کسی طور بھی درست نہیں اور تصوف کی آخری منزل فنا نہیں بقا ہے اور خود اقبال کا فلسفہء خودی اور تصور انسان کامل بھی اسلامی تصوف سے ماخوذ ہیں'' (۳۷)۔

بھارت کی مختلف یونیورسٹیوں میں اقبال پر ہونے والے پی ایچ۔ڈی کی سطح کے تحقیقی کام پر نظر ڈالی جائے تو اس میں نظریاتِ اقبال کے حوالے سے ان کی مابعد الطبیعات' تلمیحات' تصوف' مغربی اثرات' شعریات' تقابل افکار وغیرہ کو موضوع بنایا گیا لیکن ایسے مقالات بھی لکھے گئے ہیں جو براہ راست تصور خودی یا متعلقات خودی پر مبنی ہیں۔

اقبال پر پی ایچ۔ڈی کی سطح کا پہلا تحقیقی مقالہ ۱۹۴۳ء میں عشرت حسن انور نے سید ظفر الحسن کی نگرانی میں "Metaphysics OF Iqbal" کے موضوع پر لکھا جس پر انہیں شعبہء فلسفہ' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا ہوئی (۳۸)۔

تحقیقی مقالے کے مختلف ابواب میں وجدان' خودی' عالم مادی اور وجود مطلق یا خدا پر بحث ملتی ہے۔ سید ظفر الحسن کی رائے کے مطابق:۔

> ''ضرورت تھی کہ اقبال کے بنیادی تصورات' وجدان' خودی' عالم مادی اور خدا کی پوری احتیاط سے چھان بین کر کے انہیں قطعیت کے ساتھ متعین کر دیا جائے۔ ڈاکٹر عشرت نے اس مشکل کام کا بیڑہ اٹھایا اور اسے کامیابی سے پورا کیا''۔ (۳۹)۔

ڈاکٹر عشرت نے مابعد الطبیعیات اقبال کو موضوع بناتے ہوئے اولاً صرف ان کی فلسفیانہ تحریروں جو کہ بیشتر خطبات اور ایرانی مابعد الطبیعیات (تحقیقی مقالہ۔ فلسفہء عجم) پر مشتمل ہیں کو بنیاد بنایا ہے۔ ثانیاً انہوں نے اقبال کی شاعری' قرآن اور مسلم صوفیاء اور فلاسفہ کے

حوالوں سے احتراز کرتے ہوئے کہ یہ ایک علیحدہ موضوع کی حیثیت سے تحقیق کا متقاضی ہے' خود کو مغربی فلاسفہ' میک ٹیگرٹ' برگساں' نطشے' برکلے' لائبنز اور کانٹ کے اثرات اور اقبال کی اصلاحات و ترمیمات کے مباحث تک خود کو محدود رکھا ہے (۴۰)۔

ڈاکٹر عشرت کے نزدیک اقبال کا فلسفہ بھی اصل میں خودی کا فلسفہ ہے۔ اور یہ خودی ہی ان کے فکر کا نقطۂ آغاز بھی اور بنیاد بھی اور مابعد الطبیعیات تک رسائی کا ذریعہ بھی اور جس کی حقیقت کا انکشاف ان کو براہ راست وجدان کے ذریعے سے حاصل ہوا اور خودی کا وجدان ہمیں اپنے ذاتی تجربے کی حقیقت کا ایقان مہیا کرتا ہے۔ وجدان کے ذریعے ہی سے خودی کی حقیقت اور ماہیت کا انکشاف ہوتا ہے اور ہمیں اس کی ہادیانہ (Directive)' آزاد یعنی مختار (Free) اور غیر فانی صفات کا علم ہوتا ہے (۴۱)۔

خودی کی ماہیت اور اس کی مختلف صفات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے انہوں نے کانٹ' ہیگل' ڈیکارٹ' میک ٹیگرٹ' برگساں' ہالڈین کو حوالہ بنایا ہے اور ایغویا خودی کو براہ راست عمل سے متعلق کیا ہے جو بقائے دوام کے استحقاق کا ذریعہ بنتی ہے۔

ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی کے تحقیقی مقالے کا موضوع ہی ''اقبال کا فلسفۂ خودی'' تھا جس پر الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی (۴۲)۔

مقالہ' اقبال کی حیات' تصانیف اور ذہنی ارتقاء کے علاوہ' فلسفۂ خودی' استحکام خودی' ماخذ خودی پر مشتمل ہے جبکہ آخری باب میں مختلف اسلامی مکاتیب (جبریہ معتزلہ' اشارہ' تصوف) ہندو اور بدھ دھرم اور مغربی مادیتی فکر کی روشنی میں مقصدِ خودی کی وضاحت کی گئی ہے جو خودی سے متعلق اب تک کے مباحث میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

خود ڈاکٹر آصف بھی اس احساس کا اظہار کرتے ہیں:۔

> ''میں نے اس موضوع کے تحت علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی تعریف' نوعیت' خودی کی حیات و ارتقاء' شخصیت' لافانیت وغیرہم مسائل سے بحث کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسانی خودی کس طرح انتہائی خودی سے صادر ہوتی ہے اور اس کا خودیٔ لایزال سے کیا تعلق ہے نیز یہ کہ اس کی بقا اور استحکام کا دارمدار کن باتوں پر ہے۔ نظریہ خودی کی تشریح اس شکل میں پہلی بار اردو میں پیش کی جارہی ہے'' (۴۳)۔

ڈاکٹر آصف کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کے ماخذ پر کوئی باقاعدہ تصنیف میری نظر سے نہیں گزری' مختلف مصنفوں کے جستہ جستہ بیانات ضرور ہیں.....اور اقبال کے فلسفۂ خودی کے صحیح مقصد کی طرف تاحال توجہ نہیں دی گئی (۴۴)۔

لہٰذا فلسفۂ خودی کے ان تشنہ یا نامکمل پہلوؤں پر زیر بحث مقالے میں توجہ دی گئی ہے اور ان کمیوں کو پورا کرنے کی سعی بھی کی گئی ہے۔

> ''میں نے اس مقالے میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا مقصد انسان کو اپنی آزادانہ خودی اور شخصیت سے آگاہ کر کے کارزار حیات میں بحیثیت خالق لانا ہے' بوسیدہ روایات و عقائد کے بتوں اور پست ہمتی اور غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر فکر و عمل کو نئے ماحول اور ضروریات کے مطابق ترتیب دینا ہے'' (۴۵)۔

☆☆☆☆☆☆

پاک و ہند میں اقبال شناسی کی روایت میں ایک تموج کی صورت جشن اقبال صدی کے موقع پر دیکھنے میں آئی۔ چونکہ اقبال کے سالِ ولادت پر اختلاف کی وجہ سے پہلے ۱۹۷۳ء ہی کو اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے طور پر منانے کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں لیکن طویل

بحث وتمحیص وتجسس کے بعد بالآخر ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی اقبال کی صحیح تاریخ ولادت قرار پائی اور ۱۹۷۷ء ہی کو جشن اقبال صدی کے طور پر منانے کا فیصلہ ہوا۔ سرِ دست صرف بھارت تک محدود رہتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ سالِ اقبال کے حوالے سے شروع ہونے والی علمی وتحقیقی سرگرمیوں کا سلسلہ دراز تر ہوتا چلا گیا جن کا ذکر ومحور اقبال اور فکر اقبال ہی قرار پایا اور نتیجتاً یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آزادی کے بعد اگر بھارت میں اقبال کے حوالے سے کوئی خاموشی تھی تو وہ جشن صدی کی بدولت اقبال کے نغموں اور ترانوں میں بدل گئی۔

اس حوالے سے منعقد ہونے والی تقریبات' سیمینارز' نمائشوں اور مشاعروں کی تفصیلات بہت کچھ بیان ہو چکی ہیں۔ اقبال کی حیات اور فکر وفن پر مبنی تصنیفات وتالیفات اور تحقیقی مقالات کا تفصیلی جائزہ بجائے خود ایک تحقیقی موضوع ہے۔ دہلی' علی گڑھ' حیدرآباد' کشمیر اور کئی دوسرے شہروں میں اقبالیاتی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ علمی وادبی جرائد جیسے ''آجکل''، ''آواز''، ''اردو ادب''، ''ھما''، ''جامعہ'' (دہلی)، ''شاعر''، ''قومی آواز'' (بمبئی)، ''شیرازہ''، ''اولیاء''، ''تعمیر'' (سری نگر)، ''نگار'' (لکھنو)، ''شعور''، ''اقبال ریویو'' (حیدرآباد) کے علاوہ کئی روزانہ اخباروں نے اقبال پر خصوصی نمبر شائع کئے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن مراکز سے خصوصی پروگرام نشر ہوئے۔

شیخ عبداللہ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے کشمیر یونیورسٹی میں ''اقبال چیئر'' قائم ہوئی۔ یہ دنیا کی کسی بھی درسگاہ میں قائم ہونے والی پہلی اقبال چیئر تھی جس نے بعد میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی صورت اختیار کر لی۔

افکارِ اقبال کے فروغ کے ضمن میں علی سردار جعفری' پروفیسر اسلوب احمد انصاری' آل احمد سرور' عبدالقوی دسنوی' گوپی چند نارنگ' پروفیسر وحیدالدین' ممنون حسن خان' ڈاکٹر عبدالغنی' کلیم الدین احمد' عتیق صدیقی' مولانا سعید احمد اکبرآبادی' سید حامد جلالی' مظفر حسین برنی' حامدی کاشمیری' ظ۔ انصاری' پروفیسر شکیل الرحمٰن' عبداللطیف اعظمی اور خاص طور پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

معروف ترقی پسند دانشور اور ادیب علی سردار جعفری کی ''اقبال شناسی'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی (۴۶)۔ علی سردار جعفری ہندوستان میں اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے لئے قائم ہونے والی کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے خواجہ احمد عباس کے ساتھ مل کر اقبال پر ایک دستاویز فلم بھی بنائی جس کی فلمبندی کے لئے وہ پاکستان بھی تشریف لائے۔

کتاب کے پاکستانی ناشر نے ''اقبال شناسی'' اسی امید اور دعوے کے ساتھ شائع کی کہ یہ کتاب شاعر مشرق کی شاعری اور فلسفہ کو سمجھنے میں ممد ومعاون ہوگی کیونکہ مصنف نے اقبال کے فلسفہ اور شاعری کا جائزہ ایک نئے زاویئے سے لیا ہے اور افکار اقبال کو ان کے تاریخی تناظر میں سائنسی نقطۂ نظر سے پرکھا ہے (۴۷)۔

ادب کے قارئین کے لئے یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں کہ یہ ''نیا زاویہ'' ترقی پسندانہ ہے جو بالآخر عظمتِ اقبال کی دریافت کا ذریعہ بنا ہے۔

کتاب کا انتساب جناب اندر کمال گجرال کے نام ہے اور ابتداء میں ''سردار اور اقبال'' کے عنوان کے تحت آل احمد سرور کا درج ذیل قطعہ دیا گیا ہے:۔

ہماری فکر بھی اقبال کے شعلے سے روشن ہے
اسی کے فیض سے روشن ہمارے خوں کی لالی
سُرور اس واسطے سردار سے مجھ کو محبت ہے
کہ ہم دونوں ہیں گو مجرم مگر مجرم ہیں اقبالی
(۴۸)

سردار جعفری نے آغاز میں اپنی ایک نظم بعنوان ''اقبال'' بھی شامل کی ہے جس میں اقبال کے اسلوب میں اقبال کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا گیا ہے:۔

ناتوانوں کو عطا کی قوت ضرب کلیم
تو نے بخشے ملتِ بے پر کو بال جبرئیل
آزران عصرِ حاضر کے صنم خانوں میں آج
گونجتا ہے تیرے دم سے نغمہء ساز خلیل
(۴۹)

اقبال کی شاعری نے مختلف سطحوں پر بیداری کا جو عمل پیدا کیا' سردار جعفری اس کو تین دائروں میں تقسیم کرتے ہوئے پہلے اقبال کو مسلم بیداری کا شاعر قرار دیتے ہیں جس میں ایشیائی بیداری بھی شامل ہے۔ دوسرا دائرہ ہندوستان کی بیداری ہے جس میں پوری تحریک آزادی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ ان دائروں سے گزر کر اقبال عالم انسانیت کی بیداری کے تیسرے دائرے کو چھوتے ہیں جس میں سردار جعفری نے اشتراکی افکار و انقلاب کی فتح کو بھی شامل کیا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اقبال کی دوسری اور تیسری حیثیت ان کی پہلی حیثیت کی تردید نہیں بلکہ توثیق اور توسیع ہے جو صحیح معنوں میں اقبال کو ایک عالمی شاعر کے مرتبے پر فائز کرتی ہے (۵۰)۔

اسی دیباچے میں کچھ آگے چل کر وہ اقبال کے فکری تضادات کو تسلیم بھی کر لیتے ہیں جو ان کے عہد کی دین ہیں لیکن ان تضادات کے نتیجے میں اقبال کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی (۵۱)۔ شاید اسی لئے انہوں نے ان تضادات کی نشاندہی اپنی اس کتاب میں ضروری خیال نہیں کی البتہ اسی کتاب میں شامل تین مقالات: ۱۔ شاعر مشرق ۲۔ اقبال اور فرنگی ۳۔ اقبال کا تصور وقت' کے بارے میں اتنی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے کہ ان میں اقبال کے فکر و شعر کے ان ترقی پسند پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے بغیر اقبال کی عظمت کا راز سمجھ میں نہیں آ سکتا (۵۲)۔

سردار جعفری نے ''اقبال شناسی'' میں شامل پہلے مضمون ''شاعر مشرق (تحریک آزادی کے پس منظر میں)'' کی ابتداء میں لکھا:۔

''۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی رات کو جب ہندوستان کی آزاد مجلس قانون ساز (Constituent Assembly) میں آزاد ہندوستان کا ترنگا جھنڈا پیش کیا گیا تو شریمی سوچترا کرپلانی نے اقبال کا ترانہء ہندی گایا'' (۵۳)۔

گویا اقبال کے حوالے سے ہندوستان میں سرکاری پالیسی کی بنیاد یہی ''ترانہء ہندی'' ہی قرار پایا اور بعد میں اسی کی تکرار اور اسی کا چرچا زیادہ کیا گیا جیسا کہ رفیع الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ اقبال کے ساتھ اہلِ ہند کی محبت کا سب سے بڑا حوالہ ''ترانہء ہندی'' ہی ہے جو اقبال کی یاد میں جاری کئے گئے یادگاری ڈاک ٹکٹ پر اقبال کی شبیہ کے ساتھ بھی درج ہوتا ہے اور اہل قلم کے مباحث میں بھی زیادہ زور اقبال کی شاعری کے ''ہندوستانی عناصر'' پر ہی دیا جاتا ہے'' (۵۴)۔

اقبال کے حوالے سے مرتب کی جانے والی ایسی سرکاری پالیسیوں سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے محض بھارت تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کیا ہم اور آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ وطن عزیز میں مزدور کسان کا نعرہ بلند کرنے والی جماعت برسر اقتدار آ جائے تو ذرائع ابلاغ شب و روز ''اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو'' کے انقلابی ترانوں سے گونجتے رہتے ہیں اور اگر کوئی ڈکٹیٹر جمہوری عمل معطل

کر کے اقتدار پر قابض ہو جائے تو اقبال کو جمہوریت مخالف ثابت کرنے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ گویا بندوں کو گننے کا نظام ختم اور تولنے کا کام شروع ہو جاتا ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ ترازو ڈکٹیٹر کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور چٹے بٹے سب اس کی اپنی تھیلی ہی کے ہوتے ہیں۔ گویا سرکار بدلتے ہی سرکاری پالیسی بھی بدلتی رہی ہے اور اقبال کے مفید اور من پسند پہلوؤں کا ہی چرچا کیا جاتا رہا ہے۔ دراصل یہ بھی سرکاری سرپرستی کا ایک شاخسانہ ہے کہ قومی شاعر اور مفکر مختلف حکومتوں کے ہاتھوں میں ''یرغمالی'' بن کے رہ جاتا ہے اور حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کی نئی شان اور نئی آن سامنے آتی رہتی ہے۔ سرکاری دانشوروں کے لئے قومی شاعر کو اسلام دوست' انسان دوست' جمہوریت مخالف وغیرہ ثابت کرنا قطعاً مشکل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی مصلحتوں اور پالیسیوں کے شکار ہو کر قومی شاعر کے اشعار اور افکار شکار کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں نہ تو افکار کی وحدت برقرار رہتی ہے اور نہ ہی ان افکار کی اساس پر قائم ہونے والی مملکت میں کبھی حقیقی رنگ ہی بھرے جا سکتے ہیں۔

جشن ولادت کی مناسبت سے شائع ہونے والی اہم کتابوں میں سے ایک پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی ''اقبال کی تیرہ نظمیں'' بھی ہے جس میں اقبال کی طویل اور مختصر اہم نظموں کی تشریح و تفسیر پیش کی گئی ہے۔ ان نظموں میں جہاں ''شمع و شاعر''، ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''، ''خضر راہ''، ''طلوع اسلام''، ''مسجد قرطبہ''، ''ذوق و شوق'' اور ''ساقی نامہ'' اور ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' شامل ہیں وہیں ''تسخیر فطرت''، ''تنہائی''، ''لا الہٰ الا اللہ''، ''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام'' اور ''شعاع امید'' کو بھی منتخب کیا گیا۔

کتاب میں شامل تیرہ نظموں کے بارے میں نظموں کے شارح پروفیسر انصاری کا کہنا ہے کہ:۔

> ''ان منتخب نظموں کو تحلیل' تجزیئے اور چھان بین (Evaluation) کے اس عمل سے گزارا گیا ہے' یعنی ان نظموں کی بیرونی ہیئت اور جسمانیت پر نظریں جما کر یہ پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے اندر خیالات اور مرکزی اقدار حیات کس طرح کے تفاعل سے منسوب کئے جا سکتے ہیں'' (۵۵)۔

لیکن تحلیل' تجزیئے اور چھان بین کے اس عمل کے لئے جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ منفرد ہے اور اس کی سطح بلند ہے۔ اہم شعری و تنقیدی مصطلحات کے انگریزی مترادفات بھی عبارت میں جا بجا دیئے گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر تشریح و تجزیہ عام سطح کے اعتبار سے مشکل پسندی سے گرانبار ہے اور شرح مزید کی طلب بدستور رہتی ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا ایک اور مجموعہ مضامین ''نقش اقبال'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ علی گڑھ سے ان کی ادارت میں نکلنے والا مجلّہ ''نقد و نظر'' بھی ان کی علمی اور اقبالیاتی خدمات کا آئینہ دار ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی ادبیات سے تعلق رکھنے والے دو اصحاب نظر ایسے ہیں جن کا بھارت میں اقبال شناسی کی روایت کے حوالے سے ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر عبدالمغنی کے اسمائے گرامی محتاج تعارف نہیں۔ اردو تنقید میں پروفیسر کلیم الدین احمد کی ''نظر'' کا بہت تذکرہ اور چرچا رہا ہے کہ ''جب بھی ڈالی بُری نظر ڈالی'' کے مصداق ان کی جارحانہ اور جانبدارانہ تنقید اپنی سنسنی خیزی کی بدولت متوجہ ہی نہیں مشتعل بھی کرتی ہے جبکہ ان کے برعکس ان کے ہم وطن اور ہم عصر ڈاکٹر عبدالمغنی کی تنقید میں ٹھہراؤ' وزن اور استحکام جیسی خصوصیات موجود ہیں۔

کلیم الدین احمد کی ''اقبال۔ ایک مطالعہ'' (۱۹۷۹ء) میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کا بیشتر علمی و تحقیقی کام اقبال سے متعلق ہے۔ انہوں نے ''اقبال اور عالمی ادب'' (۱۹۸۲ء)' ''اقبال کا نظام فن'' (۱۹۸۴ء)' ''تنویر اقبال'' (۱۹۹۰ء)' ''اقبال' دی پوئٹ'' (Iqbal- The Poet) (۱۹۹۰ء) اور ''اقبال کا نظریہ خودی'' جیسی کتابیں لکھ کر برصغیر میں ایک اقبال شناس کے طور پر بھی خود کو منوایا ہے۔

کلیم الدین احمد کے تنقیدی ہتھیار ان کے خود ساختہ مغربی معیارات ہیں جن پر اردو شعر و ادب کی کوئی بھی شخصیت حتیٰ کہ

اقبال بھی پورے نہیں اترتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عبدالمغنی خم ٹھونک کر میدان میں اترتے ہیں اور اقبال کے دفاع میں اپنا پورا تنقیدی زور صرف کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ہاشمی نے مطالعہ اقبال کے حوالے سے جہاں ان دونوں معاصر ناقدین کی کتابوں کو مختلف اور متضاد زاویوں سے تعبیر کیا ہے(۵۶)۔ وہیں عتیق صدیقی کی تصنیف ''اقبال' جادوگر ہندی نژاد'' کو بھی بھارت میں لکھی جانے والی پیچیدہ کتابوں میں شمار کیا ہے جو مطالعہء اقبال کے بعض اہم زاویوں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے(۵۷)۔

بھارت میں اقبال کے حوالے سے ہونے والے کام کا جائزہ لیتے ہوئے ہم پہلے ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ فقرہ جو ایک طرح سے ان کے ایک علمی فیصلے کی حیثیت رکھتا ہے' نقل کر چکے ہیں کہ ''ہندوستان میں علامہ اقبال پر سب سے زیادہ اور سب سے بہتر کام پروفیسر (جگن ناتھ) آزاد ہی نے کیا ہے''۔ یقیناً یہ رائے مستحسن ہوگی لیکن دیکھنا یہ ہے کہ سب سے زیادہ کیا جانے والا کام کیونکر سب سے بہتر بھی ہے' اور بھارت میں مطالعہ اقبال کے حوالے سے جو مختلف زاویہء ہائے نگاہ اب تک زیر بحث آئے ہیں' پروفیسر آزاد کا کام کہاں تک ان سے مطابقت رکھتا ہے اور کہاں ان سے مختلف اور منفرد ثابت ہوتا ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو عیسیٰ خیل' ضلع میانوالی (پاکستان) میں جنم لینے والے جگن ناتھ آزاد کا شمار برصغیر کے ممتاز شعراء اور نامور اقبال شناسوں میں ہوتا ہے۔ ان کے والد تلوک چند مرحوم بھی اردو کے نامور شاعر اور استاد تھے جنہوں نے آزاد کی علمی اور ادبی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم میانوالی ہی میں حاصل کی۔ بی۔ اے ۱۹۳۷ء میں گورڈن کالج راولپنڈی سے کیا۔ ۱۹۴۴ء میں ایم اے فارسی اور ۱۹۴۵ء میں ایم۔ او ایل کی ڈگریاں پنجاب یونیورسٹی' لاہور سے حاصل کیں۔ وہ صحافت اور وزارت اطلاعات سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ شعبہ اردو' جموں یونیورسٹی (جموں و کشمیر) سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۳ء تک ڈین فیکلٹی آف اورینٹل لرننگ' جموں یونیورسٹی کی ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے۔ ۱۹۸۸ء سے اپنی وفات (۲۰۰۴ء) تک وہ تاحیات ایمریٹس فیلوشپ جموں و کشمیر یونیورسٹی کے منصب پر فائز تھے۔

جگن ناتھ آزاد اس کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتے ہیں کہ اپنے والد کے علاوہ ان کو شعر و سخن میں مولانا تاجور نجیب آبادی کی رہنمائی بھی حاصل ہوئی اور کالج اور پھر یونیورسٹی میں ڈاکٹر آر۔ آر سٹوارٹ' جے۔ بی کنگز' پروفیسر جسونت رائے' خان بہادر شیخ نور الٰہی' پروفیسر مدن گوپال سنگھ' ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (علامہ اقبال نہیں)' مولانا علم الدین سالک' صوفی تبسم' سید عابد علی عابد اور ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے اساتذہ سے اکتساب فیض کا موقع نصیب ہوا۔ ان کے علاوہ حسرتؔ' جوشؔ' یگانہؔ' فراقؔ' جگرؔ' سید عطاء اللہ شاہ بخاری' پنڈت نہرو' مولانا آزاد' مولوی عبدالحق' سر عبدالقادر' پطرس بخاری' مولانا صلاح الدین اور حفیظؔ جیسی برگزیدہ ہستیوں سے بھی سیکھنے کا موقع ملا(۵۸)۔

ان کی اردو' انگریزی تصنیفات و تالیفات کی تعداد پچاس سے زائد ہے جس میں ان کے شعری مجموعے' طویل نظمیں' تنقیدی مضامین' خودنوشت' منتخبات' سفرنامے اور مرتبہ کتابیں شامل ہیں۔ صرف اقبال پر لکھی جانے والی اہم کتابوں کی تعداد بارہ کے قریب ہے جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اقبال اور اس کا عہد (۱۹۶۰ء)
۲۔ اقبال اور مغربی مفکرین (۱۹۷۵ء)
۳۔ اقبال کی کہانی (۱۹۷۶ء)
۴۔ اقبال اور کشمیر (۱۹۷۷ء)
۵۔ اقبال: زندگی' شخصیت اور شاعری (۱۹۷۷ء)

۶۔ مرقع اقبال (۱۹۷۷ء)

۷۔ بچوں کا اقبال (تالیف) (۱۹۷۷ء)

۸۔ فکر اقبال کے بعض اہم پہلو (۱۹۸۲ء)

۹۔ محمد اقبال: ایک ادبی سوانح حیات (۱۹۸۵ء)

۱۰۔ ہندوستان میں اقبالیات اور دوسرے توسیعی لیکچر (۱۹۸۹ء)

۱۱۔ (اقبال کی مفصل سوانح عمری ''روداد اقبال'' کا نامکمل منصوبہ)

12. Iqbal: His Poetry and Philosophy(1982)

13. Iqbal: Mind and Art (1983)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں اقبالیات اور اس سے متعلقہ موضوعات پر دیئے گئے توسیعی خطبات اور پڑھے جانے والے مقالات کی تعداد ایک سو پچاس سے متجاوز ہے۔ آپ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو بیسیوں انعامات و اعزازات سے نوازا گیا جن میں ۱۹۷۷ء میں پنجاب یونیورسٹی اقبال صدی میڈل، ۱۹۸۰ء میں اقبال میموریل ٹرسٹ، مالیر کوٹلہ، پنجاب کی طرف سے اقبال ایوارڈ مع خلعت و طشتِ سمیں اور ۱۹۸۹ء میں کشمیر یونیورسٹی، سری نگر کی طرف سے ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری بھی شامل ہے (۵۹)۔

خلیق انجم پروفیسر آزاد کے اعزازات کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''اس سے بڑا اعزاز ایک شاعر اور خاص طور سے غیر مسلم شاعر کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو پاکستان کے قیام کے اعلان کے فوراً بعد ریڈیو پاکستان، لاہور سے جو ترانہ نشر ہوا، وہ آزاد صاحب کا لکھا ہوا تھا'' (۶۰)۔

پروفیسر آزاد ۱۹۷۷ء میں لاہور اور سیالکوٹ میں منعقد ہونے والی پہلی اقبال عالمی کانگریس کی مجلس انتظامیہ کے اس فیصلے کو بھی اپنے لئے ایک بہت بڑا اعزاز قرار دیتے ہیں جس کی رُو سے کانگریس کے مندوبین پر مشتمل لاہور سے علامہ اقبال کے جدی مکان، سیالکوٹ جانے والے جلوس کی قیادت کے لئے ان (جگن ناتھ آزاد) کو منتخب کیا گیا (۶۱)۔

یہ واقعہ بھی حقیقتاً پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اقبال کے ساتھ گہری وابستگی اور اقبال عالمی کانگریس کے مندوبین میں ان کی منفرد حیثیتِ علمی کی دلیل ہے۔

۱۹۷۳ء میں اقبال کی عظمت کا ترانہ بلند کرنے کے لئے سری نگر میں اقبال نمائش کا اہتمام اور اس کے بعد بھارت کے تمام بڑے شہروں میں اس سلسلے کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے اور اقبال کے حوالے سے پائی جانے والی سرد مہری اور تنگ نظری کو مٹانے کے لئے جانفشانی سے چلائی جانے والی یہ مہم بھی پروفیسر آزاد کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

اقبال شناسی کی روایت میں، کشمیر یونیورسٹی میں ''اقبال چیئر'' کا قیام اس لحاظ سے بھی ایک اہم اقدام ہے کہ یہ دنیا کی کسی بھی علمی درسگاہ میں قائم ہونے والی پہلی ''اقبال چیئر'' تھی (بعد میں اقبال انسٹی ٹیوٹ) اور اس تاریخ ساز منصوبے کے محرک بھی پروفیسر جگن ناتھ آزاد تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پروفیسر آزاد کی کوششوں سے قائم ہونے والی پہلی ''اقبال چیئر'' ہی دوسری اقبال چیئر قائم کرنے کا ذریعہ بھی بنی تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ ۱۹۷۷ء میں اقبال عالمی کانگریس منعقدہ لاہور میں ارباب اختیار کی موجودگی میں پنجاب یونیورسٹی میں اقبال چیئر سے متعلق

سوال پروفیسر آزاد نے ہی کیا تھا اور جس کے بعد اس وقت کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو اقبال چیئر کے قیام کا اعلان کرنا پڑا۔

پروفیسر آزاد اس واقعے کا تذکرہ بڑے دلچسپ اور پُر جوش انداز میں اپنی تحریروں میں کرتے ہیں اور آخر میں یہ ضرور بتاتے ہیں:۔

''راقم التحریر کے بعض دوستوں نے ہنسی مذاق میں اس فیصلے کی مبارکباد راقم التحریر کو دی'' (۶۲)۔

پروفیسر آزاد کی اقبال کے ساتھ وابستگی کا عالم یہ ہے کہ اقبال پر بارہ کے قریب مستقل تصانیف کے علاوہ بھی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کسی نہ کسی طور اقبال کا ذکر موجود ہے جس کی توجیہہ ڈاکٹر اسداللہ وانی کے الفاظ میں اس طرح سے ہی کی جا سکتی ہے کہ:۔

''ذکر اقبال آزاد کے لئے ذکر محبوب کی حیثیت رکھتا ہے'' (۶۳)۔

آزاد کی پہلی نثری تصنیف ''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' (رپورتاژ) ۱۹۵۱ء میں دہلی سے شائع ہوئی (۶۴)۔ اس میں بھی اقبال کا ذکر موجود ہے۔ ''پشکن کے دیس میں'' سفرنامہء روس ہے جسے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اقبال' آزاد کے ساتھ ساتھ ہیں۔

اقبالیات کے موضوع پر آزاد کی پہلی تصنیف ''اقبال اور اس کا عہد'' ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی جو دراصل جموں کشمیر یونیورسٹی کی دعوت پر لکھے جانے والے درج ذیل تین لیکچروں کا مجموعہ ہے:۔

۱۔ شعرِ اقبال کا ہندوستانی پس منظر

۲۔ اقبال کے کلام کا صوفیانہ لہجہ

۳۔ اقبال اور اس کا عہد

آزاد کی اقبال کے ساتھ عقیدت اور وابستگی اپنی جگہ لیکن ان کی اقبال شناسی محض عقیدت پر نہیں بلکہ چند اہم فکری اصولوں پر استوار ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر و فکرِ اقبال سے متعلق آزاد کے تصورات' بعض پرستارانِ اقبال کے مبہم اور موقع پرستانہ نظریات کے برعکس بہت واضح' شفاف اور مکمل تھے۔ ''اقبال اور اس کا عہد'' کی ابتدائی سطور میں خود انہوں نے اس کی وضاحت بھی کی ہے:۔

''تقسیم ہند کے بعد جہاں پاکستان نے اقبال کو اپنا ملی ہیرو قرار دیا وہاں ہندوستان نے اقبال سے ایک طرح کی بے اعتنائی برتی۔ یہ بے اعتنائی انہی غلط فہمیوں کا نتیجہ تھی جو پرستارانِ اقبال نے اقبال کے بارے میں پیدا کی ہیں اور ابھی تک جن کا سلسلہ جاری ہے'' (۶۵)۔

اقبال کے معتقدین یا مخالفین کی جانب سے اقبال کے بارے میں پیدا کی جانے والی غلط فہمیوں یا اقبال کے ساتھ روا رکھی جانے والی مخاصمت کے کئی فکری اور سیاسی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کو دو وجوہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اولاً اقبال کی اسلامی اصولوں کے ساتھ بے پایاں وابستگی اور ثانیاً ان اسلامی اصولوں کی اساس پر ایک الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ۔

جگن ناتھ آزاد نے اس حوالے سے ہمیشہ واضح اور اصولی مؤقف کا اظہار کیا اور مخالفین کو اس کا جواب مدلل طور پر فراہم کیا ہے۔

اسلام کی محبت نہ تو اقبال کی عظمت کو کم کرتی ہے اور نہ ہی آزاد کے الفاظ میں اسے اقبال اور کلام اقبال کے ساتھ بے اعتنائی برتنے کا جواز بنایا جا سکتا ہے کہ تاریخ ادب میں اقبال کوئی پہلی مثال نہیں ہیں۔ آزاد نے ملٹن اور دانتے کی مثال دی ہے جو عیسائیت کی محبت سے سرشار تھے جبکہ تلسی داس اور رابندر ناتھ ٹیگور کے کلام میں ہندو دھرم سے عشق بے پایاں کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے اور آزاد کے نزدیک تو عشقِ مذہب' عشق بنی نوع انسان تک پہنچنے کا ایک صالح ذریعہ ہے (۶۶)۔

پروفیسر آزاد تصور پاکستان کے حوالے سے اقبال کے کردار کو نہ صرف واضح طور پر تسلیم کرتے تھے بلکہ کسی سیاسی مصلحت کا شکار

ہوئے بغیر اپنا مؤقف پیش کرتے تھے۔ ایک انٹرویو کے دوران ان کو کسی نام نہاد تحقیق کے حوالے سے تصور پاکستان اور مسلم سٹیٹ کے دو الگ نظریات میں الجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے دوٹوک انداز میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:۔

''یہ صحیح ہے کہ علامہ کی نظم یا نثر میں پاکستان کا لفظ موجود نہیں لیکن آپ جسے ایک الگ مسلم سٹیٹ کہہ رہے ہیں وہ پاکستان ہی تو ہے''(۶۷)۔

اس سے یہ سمجھ لینا بھی قطعی طور پر درست نہیں کہ انہوں نے اقبال کو جو کچھ لکھا وہ اقبال کی عقیدت سے سرشار ہو کر لکھا یا پھر محض اقبال کی حمایت میں تحریر کیا بلکہ ان کا مطالعہء اقبال' گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہے اور فکرِ اقبال سے متعلق کئی اہم سوال بھی اٹھاتا ہے اور اقبالیات کے طالب علموں اور سکالروں کو دعوتِ فکر بھی دیتا ہے جیسے ایڈورڈ تھامپسن' جواہر لال نہرو اور کانٹ ویل سمتھ نے جو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اقبال اپنی عمر کے آخری حصے میں مطالعہء پاکستان کے حامی نہیں رہ گئے تھے تو اس ضمن میں پروفیسر آزاد اپنے واضح مؤقف کا اظہار کرتے ہیں کہ اقبال کی کسی تحریر (نظم یا نثر) سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مطالعہء پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے' البتہ وہ اس مسئلے پر کھل کر بحث کرنے پر زور دیتے ہیں تاکہ ہماری نئی نسل اقبال کے بارے میں کم از کم اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو کہ اقبال نے اپنے دور کی اہم ہستیوں سے کہا کچھ اور' اور اپنی کتابوں میں لکھا کچھ اور (۶۸)۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اقبال شناسی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے بھارت میں جب اقبال پر لکھنے کا آغاز کیا تو اس حوالے حالات ناموزوں اور ناسازگار تھے لیکن یہ ان کی اقبال دوستی اور ثابت قدمی تھی جو حالات کو سازگار بناتی چلی گئی۔

ہمارے عہد کے اس نامور انسان دوست اور اقبال دوست پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مورخہ ۲۴ جولائی ۲۰۰۴ء کو رات نو بجے دہلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے آخری دنوں میں بھی اقبال سے متعلق کئی علمی منصوبوں کی تکمیل میں منہمک تھے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ عطاء الحق قاسمی' روزن دیوار سے (الوداع جگن ناتھ آزاد)' روزنامہ ''جنگ'' لاہور' ۱۲ اگست ۲۰۰۴۔

۲۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے جگن ناتھ آزاد کے اس اقتباس سے اپنے مضمون ''بھارت میں اقبالیات'' کا آغاز کیا ہے جو ان کی کتاب ''اقبالیاتی جائزے'' شائع کردہ گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۹۰ء (۱۴۵) میں شامل ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے مضمون ''ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد'' کا ماخذ مجلّہ ''اوراق'' لاہور' جون' جولائی ۱۹۸۹ء درج کیا ہے۔ یہی مضمون مکمل صورت میں ''اردو زبان۔ مسائل اور امکانات'' مرتبہ سید شوکت علی شاہ' مجلس تقریبات ملی' پاکستان لاہور ۱۹۹۲ء (۱۰۶'۱۷) میں بھی شامل ہے۔

۳۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی' اقبالیاتی جائزے' ص ۱۴۵۔

۴۔ ایضاً ص ۱۴۵'۱۴۶۔

۵۔ جگن ناتھ آزاد' ہندوستان میں اقبالیات (آزادی کے بعد) ص ۷۴'۸۲۔

۶۔ ''روح اقبال'' پہلے ایڈیشن ۱۹۴۳ء کے بعد ۱۹۴۴ء' ۱۹۵۲ء' ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء میں بھی شائع ہوئی اور یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ پاکستان میں پہلی بار یہ تصنیف ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔

۷۔ تفصیلات کیلئے دیکھئے دیباچہ ''روح اقبال'' پاکستانی ایڈیشن' آئینہ ادب' لاہور ۱۹۶۳ء۔

۸۔ ڈاکٹر شبیہ کاظمی' تنقیدی تجزیے (پبلشر کا نام نہیں دیا گیا) ۱۹۹۳ء' ص ۳۶۔

۹۔ مسعود حسین خاں، تعارفی کتابچہ (ہندوستانی ادب کے معمار)، یوسف حسین خان، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۱۹۹۰ء، ص

۱۰۔ ڈاکٹر سجید انداسنہا کی ضخیم انگریزی تصنیف: "Iqbal: The Poet and His Message" رام نرائن لال پبلشر اینڈ بک سیلر، الہ آباد کی طرف سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۔ قاضی احمد میاں اختر (جوناگڑھی)، اقبالیات کا تنقیدی مطالعہ، ۱۵۷۔

۱۲۔ سید عبدالواحد معینی، نقش اقبال، آئینہ ادب، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۱۷۷۔

۱۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، اقبال کے کچھ غیر ملکی مداح، صحیفہ (اقبال نمبر) ۱۵، ۱۶۔

۱۴۔ پروفیسر میاں محمد شریف کے سنہا کے نام لکھے گئے خط کا اردو ترجمہ ''اقبال کا شعری پیام'' (ڈاکٹر سنہا کی کتاب پر تنقید) کے عنوان سے ''مقالات شریف'' شائع کردہ بزم اقبال لاہور ۱۹۹۴ء (ص ۹۳۔۱۰۳) میں شامل ہے۔

۱۵۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، اقبال کے کچھ غیر ملکی مداح، ص ۱۵۔

۱۶۔ دیکھئے ڈاکٹر سنہا کی کتاب میں شامل سر تیج بہادر سپرو کی رائے ص xxxi، ص xxxiv۔

۱۷۔ مرزا یار جنگ کے تعارفی کلمات کو بھی ڈاکٹر سنہا کی کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ تفصیل کیلئے دیکھئے کتاب مذکورہ کا ص xi۔

۱۸۔ پروفیسر میاں شریف کے ڈاکٹر سنہا کے نام لکھے گئے خط کا اردو ترجمہ ''اقبال کا شعری پیام (ڈاکٹر سنہا کی کتاب پر تنقید)'' کے عنوان سے ''مقالات شریف'' شائع کردہ بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۴ء (۹۳۔۱۰۳) میں شامل ہے۔

۱۹۔ مجنوں گورکھپوری کی کتاب (یا کتابچہ) ''اقبال (اجمالی تبصرہ)'' ایوان اشاعت گورکھپوری کی طرف سے شائع ہوئی، اس کے ساتھ ہی آسی پریس، گورکھپور کے الفاظ بھی درج ہیں۔ اگلے صفحہ پر تاریخ اشاعت کہیں درج نہیں البتہ تعارفی صفحات میں ایک جگہ ۱۹۵۰ء لکھا ہے جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سال اشاعت بھی ۱۹۵۰ء ہوسکتا ہے۔

۲۰۔ مجنوں گورکھپوری، اقبال (اجمالی تبصرہ) ص ۱۔

۲۱۔ ایضاً ص ۴۔

۲۲۔ ایضاً ص ۵۔

۲۳۔ تفصیلی بحث کیلئے دیکھئے اقبال (اجمالی تبصرہ) ص ۱۸ تا ۲۰۔

۲۴۔ ایضاً ص ۱۰۶۔

۲۵۔ اقبالیاتی جائزے، ص ۱۶۷۔

۲۶۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، بھارت میں اقبال شناسی (مضمون) مشمولہ ماہنامہ ''کتاب نما'' مکتبہ جامعہ نئی دہلی، اپریل ۱۹۹۰ء، ص ۱۵۔

۲۷۔ ڈاکٹر خلیق انجم، ہندوستان میں اردو تحقیق و تدوین کا کام (۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۵ء تک) (مقالہ) مشمولہ بھارت میں اردو، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۷۔

۲۸۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، بزم اقبال، لاہور، بار سوم ۱۹۶۴ء، ص ۸۔

۲۹۔ سید عبدالواحد، نقش اقبال، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۲۔

۳۰۔ عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل، مکتبہ ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳، ۴۔

۳۱۔ تفصیل کیلئے دیکھئے، اقبال کامل، ص ۹۴ تا ۹۷۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۴۷۔

۳۳۔ اقبالیاتی جائزے، ص ۱۶۰۔

۳۴۔ پروفیسر سراج الدین نے این میری شمل کی یاد میں لکھے گئے ایک مضمون میں انہیں عالم خوندمیری کے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کا نگران بھی بتایا ہے۔ دیکھئے ماہنامہ ''اقبال ریویو'' اقبال اکیڈمی، حیدرآباد (دکن)، نومبر ۲۰۰۳ء، ص ۶۹۔

۳۵۔ نقش اقبال، ص ۱۶۹۔

۳۶۔ تفصیل کیلئے دیکھئے ڈاکٹر میر ولی الدین کی تصنیف ''رموز اقبال''، کتاب منزل، لاہور، طبع دوم ۱۹۵۰ء میں شامل مضمون فلسفہ خودی (ص ۱۱ تا ۶۴)۔

۳۷۔ میکش اکبرآبادی، نقد اقبال، آئینہ ادب، لاہور، طبع سوم ۱۹۷۰ء، ص ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸۔

۳۸۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور کا تقریباً اسی (۸۰) صفحات پر مشتمل تحقیقی مقالہ "Metaphysics of Iqbal" پہلی بار شیخ محمد اشرف، لاہور کی طرف سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ ''اقبال کی مابعد الطبیعات'' کے عنوان سے ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے کیا جو پہلی بار ۱۹۷۷ء میں اور دوسری بار ۱۹۸۸ء میں اقبال اکادمی پاکستان لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

۳۹۔ پیش لفظ، اقبال کی مابعد الطبیعات، ص ۷۔

۴۰۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور نے اپنے طریق تحقیق کی تفصیلی وضاحت دیباچے میں کی ہے، دیکھئے ص ۹ تا ۱۱۔

۴۱۔ اقبال کی مابعد الطبیعات، ص ۶۱۔

۴۲۔ ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی کا مقالہ ''اقبال کا فلسفہ خودی'' اردو اکیڈمی، سندھ ۱۹۷۷ء میں شائع کر چکی ہے۔

۴۳۔ اقبال کا فلسفہ خودی، ص ۱۰۔

۴۴۔ ایضاً ص ۱۱، ۱۲۔

۴۵۔ ایضاً ص ۱۲، ۱۳۔

۴۶۔ علی سردار جعفری کی ''اقبال شناسی'' پاکستان میں پیپلز پبلشنگ ہاؤس، لاہور کی طرف سے پہلی بار دسمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔

۴۷۔ ایضاً، عرض ناشر۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۶۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۹۔

۵۰۔ دیباچہ، اقبال شناسی، ص ۱۱۔

۵۱۔ ایضاً ص ۱۲۔

۵۲۔ ایضاً ص ۱۲۔

۵۳۔ ایضاً ص ۲۱۔

۵۴۔ اقبالیاتی جائزے، ص ۱۶۱۔

۵۵۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پیش لفظ ''اقبال کی تیرہ نظمیں''، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۱، ۲۔

۵۶۔ اقبالیاتی جائزے، ص ۲۰۵۔

۵۷۔ ایضاً ص ۱۸۱۔

۵۸۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے بارے میں یہ تفصیلات' محمد اسداللہ وانی کے ساتھ ایک بات چیت میں بیان کیں۔ یہ انٹرویو خلیق انجم کی مرتبہ ''جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات)'' محروم میموریل لٹریری سوسائٹی' نئی دہلی (۱۹۹۳ء) اور ''اقبالیات آزاد'' مرتبہ ڈاکٹر محمد اسداللہ وانی (۱۹۹۷ء) میں شامل ہے۔

۵۹۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تصنیفات اور اعزازات کی تفصیل کیلئے ''اقبالیات آزاد'' مرتبہ ڈاکٹر محمد اسداللہ وانی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ البتہ یہ تصحیح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ''انعامات و اعزازات'' کے عنوان سے صفحہ نمبر ۸۸ پر نمبر شمار ۸۰ کے تحت پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۹۱ء کی جانب سے یاسمین کوثر کو ''جگن ناتھ آزاد بطور اقبال شناس'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دیئے جانے کی اطلاع ہے جو درست نہیں۔ اسی طرح صفحہ ۸۹' نمبر ۹۴ کے تحت اسی یونیورسٹی سے ۱۹۹۲ء میں عاصمہ عزیز کو ''جگن ناتھ آزاد بطور نثر نگار'' پر لکھے جانے والے مقالے پر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کی اطلاع بھی درست نہیں ہے۔ یہ دونوں مقالات ایم۔اے کی ڈگری کے حصول کیلئے لکھے گئے۔

۶۰۔ خلیق انجم' جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات) ص ۱۰۔ اس ترانے کا پہلا بند درج ذیل ہے:۔

اسرزمین پاک!
ذرے ذرے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک
تندیء حاسداں پہ ہے غالب تیرا سواک
دامن وہ سل گیا ہے جو تھامد توں سے چاک
اے سرزمین پاک!

۶۱۔ ''اقبالیات آزاد'' میں شامل انٹرویو (جگن ناتھ آزاد سے بات چیت'' ص ۱۷۱۔

۶۲۔ ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد' ص ۱۰۴' ۱۰۵۔

۶۳۔ اقبالیات آزاد' ص ۱۳۵۔

۶۴۔ ''اقبالیات آزاد'' میں ''تصنیفات و تالیفات'' کے تحت اس رپورتاژ کا سن اشاعت ۱۹۵۱ء درج ہے' دیکھئے (ص ۴۱) جبکہ صفحہ ۱۳۵ پر اس کا سن اشاعت ۱۹۵۰ء درج ہے۔

۶۵۔ جگن ناتھ آزاد' اقبال اور اس کا عہد' (حرف آغاز) الادب' لاہور' پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۷۷ء' ص ۱۰۔

۶۶۔ ایضاً ص ۱۰' ۱۱۔

۶۷۔ اقبالیات آزاد (جگن ناتھ آزاد سے بات چیت) ص ۱۸۱۔

۶۸۔ جگن ناتھ آزاد' اقبال اور مغربی مفکرین' مکتبہ عالیہ' لاہور' پاکستان میں پہلی بار ۱۹۷۷ء' ص ۸۵۔